سید محمد اشرف کے افسانوں کی عصری معنویت

ڈاکٹر محمد احتشام الحق انصاری

ملخص

کسی بھی ملک کی سیاسی، تہذیبی و معاشرتی زندگی کا حال جاننے کے لیے اس ملک کے سنجیدہ قلم کاروں کی تخلیق کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادب معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کرتا ہے۔ کسی عہد کو جاننے کے لیے تاریخ کے مطالعہ سے آگے بڑھ کر اس عہد کے ادبی فن پاروں کا جائزہ لینا اس لیے لازمی ہے کہ ہر عہد میں چند قلم کار ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی تخلیقات میں اس عہد کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اردو ادب میں عادل شاہی اور قطب شاہی دور سے لے کر اب تک مختلف شعراء وادباء نے موجودہ حالات و واقعات کو ادب کا موضوع بنایا ہے۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ادب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی کہانی ایسی بھی مل جاتی ہے جس کے واقعات ہمیں اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اور معاشرہ کے بدلنے سے ادب میں بھی وہی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔

عہد حاضر میں جو ادب تخلیق کیا جارہا ہے اس میں ہندوستان کی واضح طور پر تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ پروفیسر ابن کنول، نیر مسعود، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، سلام بن رازق، غضنفر، سید محمد اشرف، شوکت حیات، جیلانی بانو کے افسانوں میں سیاسی و معاشرتی مسائل کی عکاسی ہے۔ وہیں سید محمد اشرف کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کے افسانے بہت ہی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ نویسی اور ناول نگاری میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ان کی تحریر، انداز بیان، لفظوں کی ادائیگی نہایت پُر اثر ہے۔ سید محمد اشرف کا پہلا افسانوی مجموعہ "ڈار سے بچھڑے" 1994ء میں اور دوسرا مجموعہ "بادصبا کا انتظار" 2000ء میں شائع ہوا۔ ''نمبردار کا نیلا'' ان کا طویل ناولٹ ہے۔'' آخری سواریاں'' 2016ء کا بہترین ناول ہی

نہیں بلکہ اکیسویں صدی کے بہترین ناولوں میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

سید محمد اشرف کے افسانوی مجموعہ ''ڈار سے بچھڑے'' میں کل 19 افسانے ہیں۔جن میں پہلا افسانہ " آدمی" ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار سرفراز اپنے دوست سید انور علی سے پندرہ سال بعد ملتا ہے افسانے کی ابتدا ہی میں انسانی گروہ بندی کا خوف نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں ایک طرف خونخوار انسانوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے وہیں دوسری طرف لوگ اپنا اپنا ایک مذہبی گروہ بنا رہے ہیں تا کہ ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکیں۔سرفراز اپنی خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے اپنے دوست انور کے ساتھ نکلتا ہے۔راستے میں ایک جلوس انہیں روک لیتا ہے دونوں خوفزدہ ہو جاتے ہیں جلوس نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔سید محمد اشرف نے اپنے افسانے کے مرکزی کردار کا بچپن سے نوجوانی تک کی سماجی تبدیلیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ چند سالوں کے درمیانی وقفے میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں حالات اس قدر بدل جاتے ہیں کہ کبھی انجان راستوں میں اکیلے چلتے ہوئے کوئی اجنبی چہرہ نظر آنے پر دل میں تسلی اور سکون محسوس ہوتا تھا۔مگر اب سنسان راہوں پر لوگ اجنبی چہرہ دیکھ کر سہم جاتے ہیں۔سرفراز بچپن میں اپنی خالہ کے یہاں رہ کر پڑھائی کرتا تھا سردیوں میں کالج سے آتے ہوئے دن غروب ہونے پر نہر کی پٹری پر مڑنے کے بعد جب وہ باغ میں قدم رکھتا تو اسے جنات سے بہت خوف آتا اور وہ آیت الکرسی پڑھنے لگتا۔باغ میں داخل ہونے کے بعد فجری آم سے گزرتے ہوئے وہ سہم جاتا ،اس قدر خوف کے باوجود وہ روز ایک امید کے ساتھ کالج جاتا ہے کہ لوٹتے ہوئے کوئی آدمی اسے مل جائے گا۔بچپن کا یہ ڈر بھوت پریت کا ڈر، بندروں کا ڈر، اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔اب وہ افسر کے عہدے پر فائز ہے ملک کے حالات اتنے تشویش ناک ہیں کہ آئے دن کسی نہ کسی کا قتل ہو رہا ہے بچپن میں جن سے خوف آتا تھا وہ خوف اب ختم ہو چکا، جس خوف کے سائے میں نوجوانی کی زندگی گزر رہی ہے وہی خوف ہر شخص کے اندر سمایا ہوا ہے۔ یہ خوف خونخوار درندوں سے ہے جو انسانی شکلوں میں موجود ہیں جنہیں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا۔ یہ حملہ کے وقت ہی پہچان میں آتے ہیں، اس وقت مظلوم اپنی موت کا تماشائی بننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔بچپن کا خوف جب اسے سنسان جگہوں پر محسوس ہوتا تو کسی اجنبی انسان کو دیکھنے کے بعد وہ خوف ختم ہو جاتا تھا لیکن موجودہ دور کا خوف بھوت پریت سے نہیں بلکہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے ہے۔سرفراز اپنے بچپن کے دوست انور کے ساتھ خالہ زاد بہن کی شادی میں شرکت کے لیے جاتا ہے تو راستے میں دونوں جس خوف کا سامنا کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

"سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی ,وہ خالی ذہن

کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا ,انور بتاتا رہا اگر پورا جلوس اکا دکا آدمیوں
پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی ویسے اپنی طرف سے بھی
تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں
بتائی۔"

خالہ کے گھر پہنچنے سے قبل وہ سنسان باغ جہاں بچپن میں شام ہو جانے پر سرفراز ڈرا کرتا تھا اور کسی انسان کے نظر آجانے پر اسے اطمینان ہو جاتا تھا آج اسی باغ میں انسان کو دیکھ کر وہ سہم جاتا ہے کیونکہ اب حالات بھی بدل چکے ہیں اور یہی لوگ اب مختلف واردات میں مبتلا ہیں۔

افسانہ ''چکر'' میں سید محمد اشرف نے ہرنوں کی کہانی پیش کی ہے۔افسانہ میں ایک بوڑھا ہرن جو اپنی غول کا سردار ہے اسے ایک نوجوان طاقتور ہرن اپنی سینگ سے اس قدر زخمی کر دیتا ہے کہ اسے موت بہت قریب دکھائی دیتی ہے مرنے سے قبل وہ خود کو سنبھالتا ہوا نہر کے پاس لے جاتا ہے اور نہر میں ہی سما جاتا ہے ایک چھوٹا بچہ اپنی کالی کالی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا ہے جب یہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو وہ نوجوان سردار جس نے اس کے بچپن میں بوڑھے سردار کو مار گرایا تھا اب بوڑھا ہو چکا ہے یہ بچہ جس کا نام کالو ہے وہ منظر اسکے لاشعور میں چلا جاتا ہے۔کالو بھی یہی کہانی اپنے سردار کے ساتھ دوہراتا ہے کالو جب اپنے سردار کو مارتا ہے تو اس وقت بھی ایک بچہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے۔سید محمد اشرف نے اس افسانہ میں ایک ہی کہانی کو تین بار دہرایا۔تیسری دفعہ بھی ایک چھوٹا سا بچہ یہ تمام منظر دیکھ رہا ہے۔مصنف نے افسانہ کا اختتام جن الفاظ میں کیا ہے وہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب کالو بوڑھا ہو جائے گا اور وہ بچہ جوان ہوگا تو یہی کہانی پھر سے دہرائی جائے گی۔افسانہ نگار کی زبان میں۔

" کل یہی سورج پھر نکلے گا"

افسانہ "چکر" میں ایک ہی کہانی کئی بار دہرائی گئی ہے اس کا آغاز و اختتام اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہانیوں کا چکر بن گیا ہے۔افسانے کا اہم کردار کالو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے یہ خونریزی کا چکر ہم انسانوں میں چلتا رہتا ہے ۔یہ حیوانیت حیوانوں میں کم انسانوں میں زیادہ ہے یہ انسان ہی روپیوں کے لیے،عہدوں کے لیے،یا پھر مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے سے باز نہیں آتے۔سید محمد

اشرف کا یہ افسانہ مکافات عمل پر مبنی ہے۔

''لکڑ بگھا ہنسا" ایک بہترین افسانہ ہے۔لکڑ بگھے کو علامت بنا کر انسان کی مکاری کی تصویر کشی کی گئی ہے۔افسانہ میں جس فیملی کو موضوع بنایا گیا ہے وہ لکڑ بگھے کی خبر سن کر سہمی ہوئی ہے۔منو خواب میں ڈر کر چیختا ہے تو اس کی ماں بتاتی ہے کہ لکڑ بگھا ایسا نہیں ہوتا جیسا تم خواب میں دیکھتے ہو بلکہ وہ کتے کی شکل کا ہوتا ہے وفادار کتے کی طرح پیچھے پیچھے چلتا ہے اور موقع ملتے ہی وار کر دیتا ہے یہ بہت مکار ہوتا ہے اس کے چلتے وقت پیروں سے چٹ چٹ کی آواز آتی ہے جب ماں لکڑ بگھے کی کہانی سنا چکی تو سبھی سوچ میں غرق ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنے اندر لکڑ بگھے جیسی مکاری اور عیاری نظر آنے لگتی ہے۔

سید محمد اشرف نے لکڑ بگھے کو علامت بنا کر تین کہانیاں پیش کی ہیں جن میں " لکڑ بھگا ہنسا ,"" لکڑ بھگا رویا"، " لکڑ بگھا چپ ہو گیا"۔یہ تینوں افسانے انسان کے شیطانی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔یہ مکاری و عیاری اور خونخار فطرت انسانوں کو ہی نقصان پہنچاتی ہے جانور کتنے ہی خونخوار کیوں نہ ہوں وہ اپنی نسلوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔شکاری جانور بھی دوسرے جانوروں پر حملہ آور ہوتے ہیں دوسرے جانور شکاری جانوروں کے خونخوار طبیعت سے واقف ہوتے ہیں اس لیے ان سے بچتے ہیں۔لیکن انسانوں کی مکاری کی وجہ سے ان کی اصلیت پوشیدہ ہوتی ہے جس سے لوگ ان کا شکار بن جاتے ہیں۔انسان وقت اور جگہ دیکھ کر انسان پر حملہ آور ہوتا ہے ایسے میں خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔

افسانہ ''گدھ'' میں جانوروں کی کہانی پیش کی گئی ہے جہاں پر دو خرگوش کی آپسی لڑائی دونوں کو ابدی نیند سلا دیتی ہے۔اس افسانہ کے ذریعے مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ محبت اور اتحاد سبھی کو محفوظ رکھتے ہیں۔

افسانہ "بلبلا" میں انسان کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔انسان کے خیالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ایک غریب کے یہاں دولت آجانے پر نہ صرف اس کا رہن سہن بدلتا ہے بلکہ اس کا مزاج بھی تبدیل ہو جاتا ہے مصنف نے جاگیردارانہ نظام کا زوال اور جاگیرداروں کی گرتی ہوئی حیثیت کو پیش کیا ہے۔شیخ نجیب احمد افسانہ کے اہم کردار ہیں جو کچھ سال پہلے امیروں میں گنے جاتے تھے زمینداری ختم ہونے کے بعد گھر کے حالات بالکل بدل گئے ہیں، وہ غریب ہو کر اپنے حالات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔چیئر مین دلاور علی کے والد نجیب احمد کے گھر نوکر تھے۔دلاور علی کے چیئر مین بنتے ہی گھر کا نقشہ بدل گیا ان کا گھر قیمتی اشیاء سے آراستہ ہے۔دلاور علی کا بیٹا نجیب احمد کے بیٹے کو چانٹا مارتا ہے تو نجیب احمد کا خون گرم ہو جاتا ہے وہ غصے میں دلاور علی کے گھر جاتے ہیں۔دلاور علی کے گھر کی قیمتی اشیاء اور ان کا رعب دیکھ کر اپنی پچھلی زمیں داری بھول جاتے ہیں۔ان کی آواز ان کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

" کہیے شیخ جی کیسے آنا ہوا؟
شیخ صاحب نے بڑی مشکل سے کانپتی ہوئی پیالی کو گرنے سے
روکا، ہواس یکجا کیے کھنکھارے اور بولے
میں۔۔۔۔میں۔؟۔۔اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے انہیں ایسا لگ رہا
تھا جیسے ہزاروں چیزیں ان کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔"

افسانوی مجموعہ "بادصبا کا انتظار" 9 افسانوں پر مشتمل ہے اس کا پہلا افسانہ ساتھی ہے اس افسانہ میں مصنف نے فیملی مالک کی گھریلو مشغولیت کو پیش کیا ہے۔ جس کا نام انور ہے رات میں کچھ گرنے کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے، وہ کمرے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی ہے تھوڑی دیر بعد اسے کوئی سایہ نظر آتا ہے انور کے آواز دینے پر وہ سامنے آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ جاتا ہے انور چور سے نرمی سے بات کرتا ہے چور کا ساتھی بھی گھر میں موجود ہے تھوڑی دیر میں اس کے بھاگنے کی آواز آتی ہے چور انور سے بتاتا ہے کہ اس کا ساتھی خوفزدہ ہو کر یہاں سے بھاگا ہے۔ چور اور انور کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوتی ہے اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہ چور کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کی ماں بہت نیک تھی، جو سجدے کی حالت میں ہی دنیا سے چل بسی۔ بات کرتے کرتے انور کو نیند آنے لگتی ہے صبح بیوی کے جگانے پر پوچھتا ہے کہ۔۔۔

"تم گھر میں دیکھ کر آو چوری تو نہیں ہوئی"

سید محمد اشرف نے اس افسانے کو الگ موڑ دیا ہے عجیب بات یہ ہے کہ چور کے ہوتے ہوئے انور کو نیند آگئی اور وہ سو گیا، چور کو دوبارہ موقع ملا لیکن اس نے چوری نہیں کی مالک کا چور کے ہوتے ہوئے سو جانا زیادہ حیرت میں ڈال دیتا ہے، چور جو کہ ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا حالات نے اسے چوری کرنے پر مجبور کیا دوبارہ موقع ملنے پر چوری نہ کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ اس کے اندر کہیں نہ کہیں غیرت باقی ہے، یا پھر انور کے حسن سلوک نے اسے متاثر کیا جس کے سبب وہ اسے اور اس کے یقین کو دوبارہ توڑ نہیں سکا، انور کا نیند آنا یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اسے چور پر کچھ اطمینان ضرور ہوا ہوگا کہ اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔ بعض دفعہ یہ چوریاں بے روزگاری کا نتیجہ بھی ہوتی ہیں جہاں بھوک انسان کو جرم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عہد حاضر میں اس طرح کے واقعات دیکھنے کو

ملتے ہیں۔

سید محمد اشرف نے اپنے افسانوں میں مسلم کرداروں کی جو تصویر کشی کی ہے اس میں معاشرے کے حقیقی کرداروں کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ان کے افسانے کے کردار دہشت کے وقت سورہ فاتحہ آیت الکرسی کا ورد کرتے نظر آتے ہیں،دہشت کے وقت عام طور پر مسلم گھرانے کے لوگ مختلف دعاؤں کا ورد شروع کر دیتے ہیں۔مدرسے کے بچوں میں یہ عام طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔سید محمد اشرف کے بیشتر کرداروں میں معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔بیسویں صدی میں لکھے گئے ان کے افسانوں میں موجودہ دور کے سیاسی و سماجی مسائل واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کی کہانیوں کے واقعات دلچسپ اور پر اثر ہوتے ہیں۔